تغافل، تجاہل یا کم نگاہی

ہمارے بزرگ دوست اور استاد ڈاکٹر صفدر محمود صاحب کے کالم "صبح بخیر" مورخہ یکم اپریل میں ایک حکایت دل ناپذیر نظر سے گذری ۔ ان کی تحریر کے تعاقب میں پہلے مکرمی ایاز امیر صاحب کے خشمگین اردو کالم "اقبال کا آفاقی پیغام اور تقسیم ہند" (جنگ، ۲۹ مارچ ۲۰۱۴ء) کا سامنا ہوا اور پھر اس کے لاحقے کے طور پر ان کی انگریزی ہجوِ ملیح (۲۸ مارچ) کی شورا شوری دیکھنے کو ملی۔ اسی اثنا میں "قلم کمان" سے بھی ایک تیرِ دراز کش نکلا اور اپنے ہدف کو پہنچا۔ یہ کارِ فغاں ابھی پایاں رسید نہیں ہوا اور لگتا ہے کہ اس ضمن میں ابھی کچھ اور نگارشات تراوش کریں گی۔

آج اکیسویں صدی ہی میں نہیں بلکہ زمانے کی قید سے آزاد ہو کو ایک عالمگیر، کائناتی اور پائیدار اساس پر علامہ اقبال بلکہ تمام بڑی شاعری، اعلی ادب اور بلندی فکر کی معنویت کا تعین جن پیمانوں سے کیا جاتا ہے وہ علامہ اقبال کی ان تین بنیادی حیثیات سے براہِ راست متعلق ہیں جن سے ان کی شناخت بنتی ہے اور جن کی اساس پر وہ نہ صرف ہمارے لیے بلکہ عالمی فکریات کے تناظر میں ایک اہم اور بلند مقام شخصیت کے طور پر ابھرتے ہیں۔ ایاز امیر صاحب کے "دو غزلے" کی تہ میں علامہ اقبال کی ان تین بنیادی حیثیات کا ایک مدھم سا ادراک تو موجود ہے لیکن کہیں تغافل، کبھی تجاہل اور کہیں کم نگاہی نے اس ادراک و اعتراف کو سطح پر ابھرنے سے روک دیا ہے ۔

اسلامی تہذیب کے اسلوبِ بیان میں تصورِ خدا، تصورِ کائنات اورتصورِ انسان، نیز ان کے باہمی ربط کو اعلیٰ ترین فکری اور ادبی سطح پر ایک نہایت بامعنی اور پرتاثیر بیانیے کی صورت میں اگر کسی نے ڈھال کر پیش کیا ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ عہدِ حاضر میں علامہ اقبال کی شاعری اور نثری/ فلسفیانہ تحریروں نے نہ صرف فکرِ جدید کے مقابل ایک تخلیقی رویہ اختیار کیا بلکہ انسان کے بنیادی سوالات کے بامعنی جواب کے طور پر اسلام کے تصورِ خدا، تصورِ کائنات اور تصورِ انسان کو اردو، فارسی شاعری کے وسیلے سے اس طرح بیان کیا کہ اس نے حسنِ اظہار اور ہنر مندی کی بلند ترین سطح کو چھو لیا۔ ان کی تیسری حیثیت ایک سماجی اور سیاسی مصلح اور رہنما کی ہے جو اپنی قوم کی رہنمائی اور مسائل کے حل کے لیے تجاویز دیتا ہے اور ان پر عمل کی راہ دکھاتا ہے۔ یہ تینوں حیثیات نہ تو ایک درجے کی ہیں نہ ان کا پیرایۂ اظہار یکساں ہے۔ اس اہم نکتے کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے اور علامہ کی زندگی سے متعلق کچھ ضروری سوانحی اور علمی تفصیلات سے صرفِ نظر کے کارن ہمارے قہرمانِ قلم کی تحریر میں مذکورہ تغافل، تجاہل اور کم نگاہی وارد ہوتی چلی گئی ہے اور صورت یہ ہو گئی کہ کلماتِ تحسین سے شروع ہونے والا کالم چند سطروں بعد جذباتی بلیک میلنگ کی دلدل میں اتر گیا۔

اقبال کے تمام سوانح نگاروں نے مختلف انداز میں تذکرہ کیا ہے کہ یہ دور علامہ کی "خانہ نشینی" اور عزلت کا دور تھا جس میں ان کی ساری توجہ اپنے علمی کام اور شعر گوئی پر مرکوز تھی تاہم ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قومی اہمیت کا کوئی معاملہ سامنے آئے اور اقبال اس کے لیے اپنی جملہ ذہنی اور عملی صلاحیتیں بروئے کار نہ لائیں۔ برطانوی استعمار کی سفاک پالیسیوں اور جابرانہ طرزِ عمل سے ہندوستان کے طول و عرض میں، بالخصوص پنجاب میں، رد عمل اور احتجاج زور پکڑ رہا تھا۔ جلیانوالہ باغ سے پہلے ہی مارچ میں رولٹ ایکٹ کے خلاف مہاتما گاندھی نے "ہڑتال" کا اعلان کیا، اس کی تاریخ بدلی مگر دلی میں اطلاع نہ ہونے کے سبب جلوس نکلا اور گولی چلی۔ ۱۶ اپریل کو ملک بھر میں ستیہ گرہ کا دن ہڑتال، جلسے جلوس لایا۔ لاہور کے ایک بڑے جلوس پر فوج نے حملہ کر دیا۔ اقبال انارکلی میں اس دلفگار منظر کے شاہد تھے۔ پہلا شخصی ردِعمل وہ بہتے ہوئے آنسو اور دعائیہ کلمات تھے جو خالد نظیر صوفی (۱۹۷۱ء، ص،۵٦) نے نقل کیے "...وہ ان شہدا کی

قربانیاں ضرور قبول کرے گا جنھوں نے عروسِ آزادی کی مانگ کے لیے اپنا گرم اور نوجوان خون پیش گیا"۔

۱۳ اپریل کو جلیانوالہ باغ کا سانحہ رونما ہوا۔ اقبال نے فی الفور نظم کہی جو اس وقت کے اخباروں میں بھی چھپی اور متعدد سوانحی کتب اور مجموعوں میں شامل چلی آتی ہے (باقیات، سالک، جاوید اقبال، رفیع الدین ہاشمی، خرم علی شفیق و دیگران)

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ پاک
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

ایاز امیر کی یہ تغافل شعاری درگذر کر دی جاتی اگر وہ اگلےہی فقرے میں ایک اور دعویٰ نہ کر دیتے کہ "Nor did Iqbal take a public position on it" ۔ اردو قارئین نے یہ ستمگر فقرہ نہیں پڑھا ورنہ ان کا احتجاج اور سخت ہوتا۔ یہ الزام دو اعتبار سے غلط ہے۔ اولاً یہ کہ "شاعر ِوقت" کا پریس میں اپنے تحریری (شعری) ردعمل اور موقف کا اعلان نہیں تو اور کیا ہے؟ ثانیاً یہ کہ ایاز امیر صاحب اس تفصیل سے بھی بے خبر ہیں کہ علامہ نے اس واقعے پر بلکہ برطانوی حکومت کی جابرانہ اور مبنی بر ظلم پالیسیوں پر نہ صرف ایک موقف قائم کیا، برملا تنقید کی بلکہ اس موقف کو زبان شعر میں بیان کرنے کے علاوہ جلسے جلوسوں، قراردادوں سے لے کر مجلس قانون ساز کے ایوان تک آوازۂ حق بنا دیا۔

مائکل اڈوائر کی دہشت ایسی تھی کہ گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی اور مولانا آزاد وغیرہ لاہور آئے تو ان کو کوئی اپنے ہاں ٹھہرانے پر تیار نہ تھا۔ اس وقت جس شخص کی جرأت اور حوصلے نے ان حضرات کو قیام گاہ فراہم کی وہ اقبال ہی کی ذات تھی (مالواڈہ، ص ۸۶ نیز ۹۸-۹۲)۔ اگلے ماہ ۲۰مئی ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی قائم کر دی گئی جس میں اگلے سال گاندھی جی کی ترک موالات بھی شامل کر دی گئی اور یوں سانحۂ جلیانوالہ کے خلاف اقبال کے فوری احتجاج سے شروع ہونے والے عمل نے ایک تحریکی شکل اختیار کر لی۔ اقبال کو تحریکِ خلافت سے بعض اصولی اختلافات تھے اور وہ بر بنائے بصیرت یہ سمجھتے تھے کہ اس میں بظاہر تو مسلمانوں کے ایک مطالبے کا سائبان تنا ہوا ہے مگر یہاں مسلمان آلۂ کار بن کر کسی اور کے مفادات کی تکمیل کر رہے ہیں اور اس سے ان کے مفاد پر زد پڑے گی۔یہ بات دیگر شواہد کے علاوہ اس وقت بھی ثابت ہوگئی جب مسلمان تعلیمی اداروں کا تو مقاطعہ کروا دیا گیا اور بنارس ہندو یونی ورسٹی بچا لی گئی۔ اس کے باوجود مصلحت عامہ اور قومی مفاد میں وہ ہر جگہ اپنی آواز پہنچاتے رہے ۔ خلافت کمیٹی قائم ہونے سے ٦ ماہ پہلے ہی وہ نومبر ۱۹۱۹ء میں موچی دروازے کے جلسے میں نظر آتے ہیں جہاں برطانوی تسلط کے خلاف ان کی قرارداد معروف ہے۔ (عبداللہ قریشی، ۱۹۸۸ء، ص ٦۵-۳٦۳، اخبار کشمیری اور خطوط بنام نیازالدین۔) قرارداد کے بعد اقبال نے ایک طویل (باغیانہ)تقریر کی (رحیم بخش شاہین، ۱۹۷۸ء، ص ۱۸۹-۱۹۰) اور یہ کہا کہ "خدا کے سوا کسی کی اطاعت ہمارے لیے واجب نہیں" اور اسی کے تسلسل میں وہ نظم ہے جو آج کلیات اردو میں "دریوزۂ خلافت" کے نام سے موجود ہے۔(ص ۲۵۳ بانگ درا نیز اقبالنامہ، ص ۱۳۲)۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر پہنچے اور ایک بڑے جلسے میں شریک ہوئے جہاں علی برادران بھی آئے تھے اور وہ نظم پڑھی جو آج کلیات_میں "اسیری" کے نام سے موجود ہے اور جو بقول رفیع الدین ہاشمی "جلیانوالہ باغ کے شہیدوں کو خراج تحسین تھا"۔

تحریری اور تقریری موقف اور نجی محفلوں میں گفتگو کے مندرجات ایسے ضدِ استعمار تھے جبھی تو سرکار ِبرطانیہ انیسویں صدی کے آغاز ہی سے سی آئی ڈی اور خفیہ محکمہ کے ذریعے علامہ کی روزانہ کی رپورٹ تیار کرواتی تھی(جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۴-۵) اور انٹیلیجنس بیوروکے ذخائر سے حال ہی میں جو روزنامچے دستیاب ہوئے ہیں وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ "سر" محمد اقبال برطانوی استعمار کی نظر میں بھگت سنگھ سے بڑا خطرہ تھے۔

اقبال کو سر کا خطاب سرکار برطانیہ کی حمایت یا خدمت کے عوض نہیں دیا گیا تھا، یہ ان کے علمی مقام کا اعتراف تھا۔ لندن ٹائمز کے ایک اور انگریزی صحافی سے ملاقات کے لیے گورنر پنجاب نے اقبال کو بلوایا اور واپس آتے ہوئے انہیں روک کر خطاب دینے کی تجویز پیش کردی۔ علامہ کے انکار پر گورنر کے چہرے پر ایک تکدرّ محسوس ہوا تو اقبال نے مولانا میر حسن کے شمس العلماء کے خطاب کی شرط پر قبول کرلیا۔ ہمارے کالم نگار اور بعض دوسرے لوگ سرکاری خطاب کو حکومت نوازی کے مترادف جانتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ خطاب لینے سے پہلے اور بعد یہ شخص برطانوی حکومت پر کیسی کڑی تنقید کرتا رہا تھا۔ "دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی" (اقبالنامہ، ص۱۹۵) اور "یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کی اقبال کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، ہاں کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے" (اقبالنامہ، ص ۲۱۲)

ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو کئی اور شخصیات ہیں جو انگریزوں کے زبردست ناقد ہونے کہ باوجود خطابات قبول کرتے رہے۔ دوسری طرف خطاب ملنے کے بعد اقبال نے انگریزی حکومت ،استعمار،تہذیبِ مغرب، سرمایہ داری، سامراجیت پر پوری بے باکی اور تواتر سے تنقید کی ہے (مثلا"خضر راہ"، ۱۹۲۳؛ "طلوع اسلام"، ۳۰ مارچ ۱۹۲۳)

آج کی نشست انہیں دو نکات پر تمام ہوتی ہے۔ اگلی قسط میں تقسیمِ ہند اور فسادات سے متعلق ایاز امیر صاحب کے خیالات پر گفتگو رہے گی۔

محمد سہیل عمر

قلم رسوا ہوا۔۔۔۔

ایاز امیر صاحب کو شکوہ ہے کہ اقبال اور مسلم لیگی قیادت عاقبت نااندیش اور مستقبل کے بارے میں درست اندازے لگانے کی صلاحیت سے عاری تھے لہٰذا ان کی نگاہ یہاں تک نہ پہنچ سکی کہ اگر تحریک پاکستان کے نتیجے میں ہندوستان تقسیم ہوا تو پنجاب پہلے کٹے گا، ہندوستان کی باری بعد میں آئے گی۔ یہ بات تو کسی حد تک درست ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں جو خونریزی اور فسادات ہوئے وہ تقسیمِ ہند کا نہیں بلکہ بڑی حد تک تقسیمِ پنجاب کا نتیجہ تھے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اقبال اور بانیانِ پاکستان کی نظر سے یہ خطرہ اوجھل رہ گیا تھا! تقسیمِ بنگال اور تقسیمِ پنجاب کی باتیں تو ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ہی منظر نامے کا حصہ بن چکی تھیں۔ علامہ اقبال اور ان کے ساتھی رہنماؤں کو اس پر غور کرنے کے لیے کسی خاص پروازِ تخیل کی ضرورت نہیں تھی ہاں ایاز امیر صاحب کو اپنی معلومات میں اضافے کی ضرورت البتہ لاحق ہونی چاہیے تھی کہ وہ علامہ اقبال کو دور اندیشی اور افلاسِ تخیل کا طعنہ دینے سے پہلے یہ جان لیتے کہ صوبوں کی تقسیم کی بحث اٹھانے والی شخصیت انھی کے ممدوح حسرت موہانی کی تھی جس نے ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے صدارتی خطبے میں نہ صرف کچھ جرأت مندانہ تجاویز پیش کیں بلکہ بعد میں بھی تجویزِ مزید کے طور پر اچھوتے خیالات سامنے لاتے رہے۔ ایاز امیر صاحب نے یہ بھی غور نہیں فرمایا کہ لالہ لاجپت رائے اور ہند مہا سبھا نے ایکا کر کے تقسیمِ پنجاب کا مطالبہ داغا تھا اور ۱۹۲۴ء میں تیرہ مضامین کا ایک سلسلہ اخبارات میں انھی کی طرف سےچھپا تھا۔ سی-آر-داس اور مولانا محمد علی جیسے قوم پرستوں کے خیالات اور ان تعصب زدہ ہندو رہنماؤں کی تجاویز میں بین فرق تھا لیکن یہ امر واضح ہے کہ ان تقسیمات کا غلغلہ ۱۹۳۰ء سے بہت پہلے بلند ہو چکا تھا جب علامہ اقبال نے خطبہ الٰہ آباد میں ایک مسلم مملکت کی تجویز پیش کی۔ تقسیمِ پنجاب کیوں ہوئی اور اس میں پس پردہ اور کھلم کھلا کیا عوامل کام کر رہے تھے یہ اب تاریخ ہے اور معلومہ تاریخ جس سے ہر پڑھے لکھے مصنف کو واقف ہونا چاہیے۔ یہ کالم اس کی تکرار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

میر صاحب اس بات پر بھی شکوہ سنج ہیں کہ علامہ نے بھگت سنگھ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہا۔ اس پر ہم میر صاحب کی خدمت میں ایک خندۂ استہزاء پیش کرنے کے علاوہ یہ یاد دلانے کی جسارت کریں گے کہ بھگت سنگھ اسی لاجپت رائے کی موت کا انتقام لینے نکلا تھا جس کے قلم سے تقسیمِ پنجاب کا مطالبہ صادر ہوا جس پر میر صاحب (جائز طور پر) اتنے چراغپا ہیں۔ نہ جانے یہ بات میر صاحب کے علم میں ہے یا نہیں!

یہ ٹھیک ہے کہ علامہ اقبال نے بھگت سنگھ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہا مگر بہت سے دوسرے رہنما بھی اس پر خاموش رہے، مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ یہ لوگ محب وطن نہیں تھے یا آزادی ہند کے لیے مخلصانہ جدوجہد نہیں کر رہے تھے؟ گاندھی جی جیسے بڑے لیڈر ہی سے بھگت سنگھ کو بچانے کے لیے کیا بن پڑا؟ کیا اس سے ان کے سیاسی مقام اور مرتبے میں کمی آگئی؟

لفظوں کے پردے کے پیچھے جھانک کر دیکھیے اور "راویانِ خبر زدہ" کے پسِ واقعہ محرکاتِ تحریر پر غور کیجیے تو کچھ یوں لگتا ہے کہ میر صاحب یہ جتانا چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال برطانوی استعمار کے ایسے مخالف نہیں تھے جتنا کہ ہونا چاہیے تھا اور اس ضمن میں ان سے کوتاہ اندیشی، نارسائی اور کوتاہ عملی منسوب کی جا سکتی ہے! اب اس کا کیا کیجیے کہ علامہ کے بدترین ناقد بھی یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ استعمار اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف اقبال کا ایک واضح، دوٹوک اور تنقیدی موقف ہے اور یہ رائے ان کے شعر میں بھی کھل کر بیان ہوئی ہے اور بطور سماجی اور سیاسی رہنما ان کے سب اقدامات تجاویز اور بیانات سے عیاں ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اگرچہ علامہ اقبال کے فکری تناظر کے مطابق یہ موقف درست تھا لیکن بعض دیگر لوگوں کو، مثلاً ایاز امیر صاحب کو، یہ موقف کسی وجہ سے ناکافی معلوم ہوتا ہو۔ ان کو اختلاف کا حق ہے۔ اس

اختلاف پر فیصلہ کن گفتگو البتہ جس وسعتِ مطالعہ، محنت اور تحقیق کا مطالبہ کرتی ہے وہ ہمارے قہرمانِ علم کے بس میں نظر نہیں آتی۔ آسان راستہ یہ تھا کہ اپنے قارئین کو اپنے دعویٰ نما بیان سے یہ باور کروا دیا جائے کہ اقبال نے استعمار اور سامراجیت کے خلاف سرے سے کوئی جدوجہد ہی نہیں کی۔ اس عمل کے کارن مسلمہ حقائق زد میں آئیں گے یا تاریخ مجروح ہو جائے گی، اس کی ایاز امیر صاحب نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ یہ تغافل ہے، تجاہل ہے یا صرف کم نگاہی؟ اسے علمی بددیانتی کہنے کی ہمت ہم میں نہیں ہے!

ہم نے اپنی تحریر کے وسط میں مقبرۂ انارکلی، لاہور، میں مدفون محکمہ سراغ رسانی کے پرانے ریکارڈ کی بازیافت کا ذکر کیا تھا۔ یہ چشم کشا دستاویزات ابھی چھپنے کے مرحلے میں ہیں (ندیم شفیق، ۲۰۱۴ء) لیکن سابقہ ریاست حیدرآباد دکن کے سرکاری ذخیرۂ دستاویزات کے کچھ متعلقہ حصے برسوں پہلے ہندوستان اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مطابق نظامِ دکن علامہ اقبال کے لیے سرکاری سرپرستی کی تجویز پر غور کر رہے تھے جب ان کے مشیروں نے یہ کہ کر انھیں اس پر عمل کرنے سے باز رکھا کہ اقبال تو برطانوی سامراج کی مخالفت کے لیے مشہور ہیں۔ اگر ان کی سرپرستی سرکارِ نظام کی طرف سے کی گئی تو ہمارے "غیر ملکی حکمران" ناراض ہو جائیں گے! آج کے نئے سامراجی بھی اقبالی فکر سے نالاں ہیں۔ ایسی ہر تحریر جو اقبال کو سامراجیت کا خاموش مداح، استعمار پرست یا اس ظالمانہ نظام کا حامی ہونے کا اشارے کنائے میں ذکر کرے کس کو خوش کر سکتی ہے؟ یہاں حدِادب آ جاتی ہے اور سوء ظن کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ رک جانا مناسب ہے۔

پاکستان میں آج جو محرومیاں نظر آ رہی ہیں یا مسائل (اور مصائب) گھیر رہے ہیں، اپنے اہداف و مقاصد حاصل کرنے میں نارسائی کا المیہ ہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ بانیانِ پاکستان میں جرأتِ کردار مفقود تھی یا وہ دور اندیشی سے عاری تھے (ایاز امیر صاحب کچھ اسی جانب اشارہ کناں ہیں) وجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ، بالخصوص دانشور اور رہوارِ قلم کے شاہسوار اپنی ہی تاریخ کے بنیادی حقائق سے غفلت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ اگر اس مرحلۂ عمر میں ہیں کہ ان کا ذہنی نظام نئی معلومات کو جذب کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو ابھرتے ہوئے مصنف اور دانشور تو اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا بیڑہ اٹھا سکتے ہیں کہ کل کا مؤرخ ان کے بارے میں بھی یہ کہنے پر مجبور نہ ہو کہ

"قلم" رسوا ہوا اہل قلم کی کم نگاہی
سے!

محمد سہیل عمر